رحمۃ اللہ علیہ کو بابر کی خدمت میں ایک عرضداشت بھیجنا پڑی کہ آپ مسلمانوں کا بھی خیال رکھیں[1]۔

ڈاکٹر تاراچند نے اپنی مشہور کتاب "ہندوستانی کلچر پر اسلامی اثرات" میں لکھا ہے کہ ہندو مسلمان بزرگوں کے مزاروں پر نذریں چڑھاتے تھے فال کے لئے قرآن شریف دیکھتے تھے، اور بھوت پریت کے اثر سے بچنے کے لئے قرآن کو اپنے گھروں میں رکھتے تھے۔ اور اسلامی تہواروں اور رسموں میں شرکت کرتے تھے۔ یہی حال مسلمانوں کا بھی تھا[2]۔

موسیو تھونو فرانسیسی سیاح، دکن کی نسبت لکھتا ہے کہ عام لوگ جن کی بڑی بڑی تنخواہیں ہیں، مسلمان ہوں یا ہندو سب ہندوؤں کی تقلید کرتے ہیں۔

ڈاکٹر برنیر لکھتا ہے کہ "سلاطین مغلیہ اگرچہ مسلمان ہیں لیکن اُن پرانی رسموں (مثلاً میلہ سورج گرہن) کے آزادانہ طور پر بجالانے کو یا تو اس خیال سے منع نہیں کرتے کہ ہندوؤں کے مذہبی معاملات میں دست اندازی نہیں کرنا چاہتے یا دست اندازی کرنے کی ہمت نہیں رکھتے"۔

دیوالی کے موقع پر مغل بادشاہ ایک ایسے برتن سے نہاتے تھے جس میں اکیس[21] چھید ہوئے تھے، بادشاہ کو تولا جاتا تھا اور وہ رقم غریبوں کو تقسیم کر دی جاتی تھی۔ اسی طرح ہولی کا تہوار جوش و خروش کے ساتھ منایا جاتا تھا۔ بسنت کے موقع پر سب بسنتی کپڑے پہنتے تھے اور ایک بڑا دربار منعقد ہوتا تھا۔ پھول والوں کا میلا (سیرگل فروشاں) ہندو مسلمانوں کا مشترک تہوار تھا۔ اکبر شاہ ثانی کو اس میں شرکت اتنی عزیز تھی کہ ایک مرتبہ بیماری کے عالم میں مسہری پر لیٹے لیٹے اس میلہ کو دیکھا اور انعامات تقسیم کیے۔ یہ تمام رسمیں بہادر شاہ ثانی کے وقت تک اہتمام کے ساتھ ہوتی رہیں[3]۔

---

[1] مکتوبات حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ [2] تاراچند ص ۲۱۷ [3] ملاحظہ ہو اسلامک کلچر جولائی ۱۹۴۳ء : دہلی ۱۸۳۷ء میں ص ۲۶۹

نظیر کے دیس پریم میں مولانا نظامی نے لکھا ہے کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے تہواروں میں شریک ہوتے تھے[1]۔ نظیر اکبرآبادی کا کلام اس کے ثبوت میں پیش کیا جاسکتا ہے اس کی رکھشابندھن وغیرہ نظمیں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈیڑھ سو برس پہلے تک جب کہ سیاسی انحطاط انتہا کو پہنچ چکا تھا، اتحاد اور یگانگت کے رشتوں میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

عہد وسطیٰ میں ہمارا فنی اور جمالیاتی شعور بھی فضا کے ان اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا۔ موسیقی میں دونوں قوموں کا اتحاد صاف نظر آتا ہے۔ خیال۔ مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ وہ ہندوؤں میں بھی مقبول ہوا اور دھرپد جو قدیم ہندو طرز تھا اس کو مسلمانوں نے شوق سے قبول کیا سلاطین بیجاپور و جون پور اور صوفیائے کرام کی کوششوں نے موسیقی کے ذریعہ ہندو اور مسلمانوں کے دلوں کو ملا دیا اور ان کے جذبات و احساسات میں یک رنگی پیدا کردی۔ اکبر کے زمانہ میں یہ موسیقی پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہر ہندوستانی کا دل ایک ہی تال، ایک ہی سُر، اور ایک ہی لَے پر دھڑکتا ہے

سلاطین دہلی کی تمام عمارتیں ہندو اور مسلم خصوصیات کی آئینہ دار اور اختلاط باہمی کی مظہر ہیں۔ دکن کی عمارتوں میں بھی ہندوانی خصوصیات نمایاں ہیں۔ اجمیر کی جامع مسجد، کوہ آبو کے جین مندر کا چربہ معلوم ہوتی ہے قطب مینار کا تمام آرائشی کام جینی طرز کا ہے۔ اسی طرح رن پور کے مندر کے ستون، بالکل مسجد کے ستون معلوم ہوتے ہیں۔ گوالیار کے راجہ مان کے محلات اسی نئے طرز کے نمونے ہیں۔ مغلوں کو پیوندکاری کا تجربہ ترکوں سے زیادہ تھا اور وہ ان کے مقابلہ پر ذوق بھی زیادہ پاکیزہ اور خیال بھی زیادہ مستقرار رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ ہندو مسلم فن تعمیر ان کے زمانہ میں معراج کمال کو پہنچ گیا۔ اکبر کی تمام عمارتیں اسی اشتراکِ خیال اور اتحادِ ذوق کا ثبوت ہیں۔ تاج

---

[1] صفحہ م

محل کا خاکہ ممکن ہے کہ بیرونی اثرات کا نتیجہ ہو لیکن بقول ڈاکٹر عابد حسین، ہے وہ ہندوستانی محبت کی یادگار اور ہندوستان کی پُر درد اور پر امن روح کا مظہر۔

اکبر نے ہندی اصلیت اور ایرانی نزاکت کی حسین آمیزش سے مصوری میں ایک نیا اسکول قایم کیا۔ جو نہ ہندو ہے، نہ مسلم۔ اگر اُس کے لئے کوئی نام ہو سکتا ہے تو "ہندو مسلم" اجنتا اور دہلی کے نقوش میں بڑا فرق ہے۔ خط۔ رنگ سب بدل گئے ہیں۔ لیکن دہلی، جے پور اور کانگڑہ کے نمونوں میں وہی فرق ہے جو ایک ہی اسکول کے دو فن کاروں کی تخلیقات میں ہوتا ہے۔ ایران اور وسط ایشیا کا اثر پوری طرح نمایاں ہے۔ لیکن ہندوستانی آرٹ نے چاہے وہ مغلوں کی سر پرستی میں پیدا ہوا ہو یا راجپوتانہ اور تجور کے ہندو راجاؤں کی سرپرستی میں، اس نے کسی جگہ بھی غیر ملکی نمونوں کی کورانہ تقلید نہیں کی لیکن اُس کی اتحاد پسندی اور مفاہمانہ روش، ہر ہر نقش میں موجود ہے

عہد وسطیٰ میں اگر یہ اتحاد و اتفاق نہ ہوتا تو ہمارا لٹریچر جو زندگی کا آئینہ دار ہے، کبھی بھی دلوں پر اثر نہ کرتا۔ ہندو مصنفین جب کبھی فارسی میں لکھتے ہیں تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کرتے ہیں اور تمہید کے طور پر حمد و نعت ضرور لکھتے ہیں۔ اسی طرح جب مسلمان ہندی میں لکھتے ہیں تو ابتدا میں شری گنیش جی اور سرسوتی جی کی تعریف و توصیف ضرور کرتے ہیں۔ رحیم نے "مدن مستک" کا آغاز سری گنیش نامہ سے کیا ہے۔ یہی حال احمد معاصر جہاں گیر کا ہے۔ یعقوب خاں نے گنیش جی، سرسوتی جی، شری رادھا کرشن جی اور شری گوری شنکر جی کی تعریف کے بعد اصل موضوع کی طرف رجوع کیا ہے۔ ملک محمد جائسی کی شاعری "ہندو مسلم" کلچر کی ترجمان ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نرگس کا بھگتی تصور اسلامی تصوف سے ہم آغوش ہو گیا ہے۔ اس کی تشبیہات تلمیحات سب ہندی ہیں اور بھگتی سے ماخوذ ہیں۔

عہد وسطیٰ کے حکمرانوں نے ہندی اور سنسکرت کی جو سرپرستی کی وہ ہنگامی یا ملکی مصلحتوں

کی بنا پر نہیں کی، بلکہ وہ ان زبانوں کی خوبیوں سے آگاہ تھے اور ایک دوسرے کے خیالات سے باخبر رہنا چاہتے تھے اکبر کے زمانہ میں مہابھارت کا فارسی ترجمہ ہوا۔ ابوالفضل اس کے مقدمہ میں لکھتا ہے۔

" خاطر نکتہ داں بر آں قرار یافت کہ کتب معتبر طائفین بزبان مخالف ترجمہ کردہ آید تاہر دو فریق .... از شدت تعنت و عناد برآمدہ جویائے حق شوند در محاسن وعیوب یک دیگر اطلاع یافتہ در اصلاح حال خود مساعی جمیلہ نمایند"

غلام علی آزاد ہندی کی تعریف میں لکھتے ہیں:۔

"معنی آفرینانِ عربی وفارسی خون از رگ اندیشہ چکانیدہ اند وشیوہ نازک خیالی را بہ عالی مراتب رسانیدہ لیک افسوس خوانانِ ہند ہم دریں وادی ہائے کمی نہ دارند"

مسلمانوں نے بنگالی، اودھی، گجراتی اور مرہٹی کی جو سرپرستی کی اس کا اندازہ ڈاکٹر چودہری کی مشہور کتاب "سنسکرتی ادب پر مسلمانوں کے احسانات" سے ہو سکتا ہے۔ یہ سرپرستی صرف امراء و سلاطین تک محدود نہیں تھی بلکہ عام مسلمانوں نے بھی ان زبانوں کو علم کے شوق میں پڑھا اور ان میں کمال پیدا کیا۔ "ہندی کے مسلمان کوی" میں ان مسلمان شعراء کے نام اور کارنامے درج ہیں جنہوں نے گیسوئے ہندی کو سنوارا ہے اسی قسم کی ایک فہرست پنڈت شیام بہاری مصرا نے اپنی تاریخ ادب ہندی میں شامل کی ہے۔

ان لوگوں نے محض خانہ پری نہیں کی بلکہ اپنے رنگ وآہنگ سے ادب وشعر میں مستقل اضافے کئے ہیں ابوریحان البیرونی سے لے کر سید علی بلگرامی تک اگر پوری فہرست پر نظر ڈالی جائے تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ سنسکرت سے دلچسپی کا اظہار عہد وسطیٰ میں گپتا عہد سے کم نہیں ہوا شاید ہی سنسکرت کی کوئی ایسی مشہور کتاب ہو جس کا ترجمہ فارسی میں نہ ہوا ہو اور

اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ ترجمہ کرنے والے بیشتر مسلمان ہی تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہماری معاشرت اتنی مضبوط اور ہماری محبت کے رشتے اتنے قوی تھے کہ سیاسی انقلابات نے دلوں کی یگانگت میں کوئی فرق پیدا نہیں کیا۔ حد یہ ہے کہ اس زمانہ کی لڑائیاں بھی مذہبی نہیں تھیں۔ نہ مسلمان بادشاہ اسلام کی خاطر لڑتے تھے اور نہ ہندو اپنے دھرم کے لئے جنگ کرتے تھے۔ اس اعتبار سے ہماری تاریخ کو یورپ کی تاریخ پر یک گونہ فضیلت حاصل ہے مسلمانوں کی فوج میں ہندو تھے اور ہندوؤں کی فوج میں مسلمان تھے۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ تامل ملک کے راجہ دیر بلالہ کی فوج میں بیس ہزار مسلمان تھے۔ سومناتھ کے راجہ کے ماتحت بھی مسلمان افسروں کی کافی تعداد تھی۔ حد یہ ہے کہ بندہ سنگھ کی فوج میں سکھوں کے علاوہ ۵۰۰۰ مسلمان بھی تھے۔ ترائن کی لڑائی میں راجپوتوں اور افغانوں نے مل کر غیر ملکی حملہ آوروں کا مقابلہ کیا ہے، پانی پت کی تیسری لڑائی میں مسلمان اور مرہٹے، ابدالیوں کے خلاف دوش بدوش لڑے ہیں۔

عہد وسطی کی ملوکیت کا تصور اسلامی نہیں، ایرانی تھا، قانون عام اپنی مرضی سے بنانا اور اسے نافذ کرنا بادشاہ کا مسلمہ حق تھا۔ گنتی کے چند بادشاہوں نے شرع کی پابندی کی لیکن بہت بڑی تعداد نے اپنے آپ کو اقتدار اعلیٰ کا مالک اور شرع سے بالاتر سمجھا۔ بقول پروفیسر حبیب حضرت علی کی شہادت کے بعد مسلمانوں کی بادشاہت کا سارا نظام غیر مذہبی تھا۔ اور ہندوستان میں تو ان کی حکومت قطعی دنیوی تھی۔

اس زمانہ کے مذہبی ادب میں جو مسلمانوں کے ذریعہ وجود میں آیا ان حکمرانوں کی والہانہ عقیدت کے ساتھ تعریف نہیں ملتی بلکہ اکثر لکھنے والوں نے تو ان کا تذکرہ ہی نہیں کیا ہے اسی طرح ہندو ادب میں کسی ایسی تحریک کا سراغ نہیں ملتا جس کو مسلمانوں کے خلاف قومی ردعمل کہا جائے۔

ابراہیم قطب شاہ نے تالی کوٹ کی لڑائی میں سرگرم حصہ لیا تھا۔ لیکن تیلگو لٹریچر میں اسے "ملکی بھرما" اور "اب ہرما" جیسے باعزت الفاظ سے یاد کیا گیا ہے[1]۔ اور بہت سے تلنگی شاعروں نے فراخدلی سے اس کی علم دوستی اور معارف پروری کا اعتراف کیا ہے۔

اس اتحاد و اتفاق کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہندی اور مرہٹی[2]، بنگالی[3]، پنجابی اور سندھی پر فارسی کا جو حکمراں طبقہ کی زبان تھی، گہرا اثر پڑا۔ یہ نقش ان کے الفاظ، تشبیہات، قواعد و اسالیب پر ثبت ہو گیا ہے۔ اور آج بھی نظر آسکتا ہے۔

اسی میل جول سے ایک نئی زبان اردو، جس کو لسانی مفاہمہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا، وجود میں آئی۔ یہ نہ ایران سے آئی ہے نہ عرب سے بلکہ اسی سرزمین پر، اسی اتحاد کی بدولت اس کی کونپل پھوٹی ہے ہندو اور مسلمان دونوں کی متحدہ کوشش سے تناور درخت بنی ہے۔ عشق کی طرح زبان کے معاملہ میں بھی فلاں ابن فلاں کا سوال نہیں ہوتا چنانچہ اس کے پاس ۵۵ ہزار الفاظ ہیں، جس میں چالیس ہزار ٹھیٹ ہندی الفاظ ہیں ورتیرہ ہزار عربی فارسی لفظ ہیں۔ کچھ سنسکرت انگریزی اور دوسری زبانوں کے الفاظ ہیں[4]۔

اسی اختلاط و ارتباط کا نتیجہ یہ ہوا (جو یقیناً تلوار کے زور یا قانون کے دباؤ سے پیدا نہیں ہوا تھا) کہ ہندی کے ہزاروں الفاظ فارسی میں مل گئے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے ہمایوں نامہ گلبدن بیگم سے ان ہندی الفاظ کی ایک فہرست مرتب کی ہے جس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں نے بلا تعصب ہندی رسم و رواج کو قبول کر لیا تھا اور اس ملک کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ راجپوتوں کی طرح یہ بھی باہر کے لوگوں کی اولاد تھے لیکن اب ہندوستان ہی کی عظمت کے لئے زندہ

---

[1] روداد انڈین ہسٹری کانگریس ۱۹۴۳ء مقالہ از پروفیسر وی نرائن راؤ [2] مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر (عبدالحق)

[3] تاریخ ادب بنگالی، سین [4] تقریر فراق گورکھپوری، قومی آواز لکھنؤ یکم جنوری ۱۹۴۹ء

تھے اور اسی کی عظمت کے لئے جان دیتے تھے۔

ایرانی ہندی کی ادبی نزاع میں بھی اسی رجحان کی کارفرمائی ہے۔ سراج الدین علی خاں آرزو اور غلام علی آزاد بلگرامی فارسی ادب میں ہندوستانی رنگ کے حامی تھے۔ آرزو و حزیں اور قتیل و غالب کے معرکوں کو بھی اسی نظر سے دیکھنا چاہئے۔

اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں بھی جب ہمارا سیاسی زوال تقریباً مکمل ہو چکا تھا ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات میں کسی قسم کا فرق نہیں آیا تھا میر کے محسنین میں ہندوؤں کی تعداد زیادہ ہے۔ خان آرزو سے کسب فیض کرنے والوں میں ہندوؤں کی تعداد نظر انداز نہیں کی جاسکتی رجب علی بیگ سرور کو لکھنؤ کے ضبط ہو جانے کے بعد اور غالب کو غدر کے پرآشوب زمانہ میں ہندوؤں سے جو مدد ملی، کیا وہ ہمارے لئے باعث فخر نہیں ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ تصویروں کی یہ لکیریں، عمارتوں کے یہ پتھر، اور کتابوں کے یہ حروف ہم سے کچھ سرگوشیاں کرتے ہیں اور ہمیں مہر و وفا کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتے ہیں۔ کیا ہم اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لیں گے اور اس آواز کو نہیں سنیں گے؟

غلامانِ اسلام

(طبع دوم)

اسی سے زیادہ ان صحابہ تابعین، تبع تابعین، فقہا و محدثین اور ارباب کشف و کرامات کے سوانح حیات اور کمالات و فضائل کے بیان پر پہلی عظیم الشان کتاب جس کے پڑھنے سے غلامانِ اسلام کے حیرت انگیز شاندار کارناموں کا نقشہ آنکھوں میں سما جاتا ہے ۴۸۸ صفحات بڑی تقطیع قیمت مجلد ۶ؕ غیر مجلد پانچ روپے آٹھ آنے طبع دوم

اجماع اور اُس کی حقیقت

از جناب محمد ہاشم صاحب ایم۔اے

(۳)

اور ہو بھی تو ہر ایک کے متعلق یہ جاننا کہ وہ صادق ہے یا کاذب اس سے زیادہ ناممکن ہے پھر اس حکم الٰہی کی تعمین کی شکل اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ "الصادقین" سے مسلمانوں کی اجتماعی حیثیت مراد لی جائے اور یہ سمجھا جائے کہ اجتماعی طور پر مسلمان جب کسی بات پر جمع ہو جاتے ہیں تو اس میں وہ باطل پر نہیں بلکہ صدق ہی پر ہوتے ہیں اور "الصادقون" کی اسی جماعت کا ساتھ دینے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے اور یہی اجماع کا مطلب ہے

متفرق دلائل آثار و احادیث سے | ان منصوصات قرآنیہ کے سوا اس قسم کی مشہور حدیثیں جنمیں فرمایا گیا ہے کہ میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی اس لیئے چاہیئے کہ جماعت کے ساتھ رہو، کیونکہ جماعت پر خدا کا ہاتھ ہوتا ہے اس کا مفاد وہی ہے جو کتابوں میں نقل کیا جاتا ہے یعنی مسلمان جس بات کو اچھا خیال کریں وہ بات خدا کے نزدیک بھی اچھی ہوتی ہے چنانچہ فخر الاسلام البزدوی نے بخاری کی اس روایت سے کہ جب حضرت ابوبکر کو امام بننے کا حکم دیا اور اس پر حضرت عائشہ نے فرمایا کہ وہ رقیق القلب ہیں تو اس پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

ابی اللہ ذلک والمسلمون — (اس سے خدا نے بھی اور مسلمانوں نے بھی انکار کیا یعنی وہی امام ہو کر رہیں گے)

یہی نتیجہ نکلا ہے کہ مسلمانوں کا اجماع بالآخر حق کو پا لے گا اور اس بنا پر ان کا کسی امر پر اتفاق اس امر کے حق ہونے کی دلیل ہے علاوہ بریں مشہور حدیث صحیحین وغیرہ کی ۔

لا تزال طائفة من امتی علی الحق — میری امت میں سے ایک گروہ ہمیشہ حق پر

ظاهرین الی ان تقوم الساعة — غالب رہے گا تا اینکہ قیامت قائم ہو جائے

وغیرہ سے جب یہ بالتواتر ثابت ہے کہ قیامت تک مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا ضرور موجود رہیگا جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق پر ہونے کی سند عطا فرماتے ہیں پس اگر سارے جہان کے مسلمان کسی غلط بات پر اتفاق کریں گے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ مسلمانوں میں اس وقت کوئی طبقہ بھی ایسا باقی نہ رہا جو حق پر تھا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ مذکورہ بالا قرآنی آیات اور احادیث جن میں اکثر صحیحین بخاری ومسلم کی ہیں اگر ان کے اجتماعی مفاد پر غور کیا جائے تو اس سے میرے خیال میں مسلمانوں کے اتفاق و اجماع کی قوت اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ قرآن و حدیث یا قیاس سے کسی مسئلہ کا تعلق اگر نہ بھی ہو جب بھی اپنے اسی حاصل شدہ اقتدار سے کام لے کر اجماعی فیصلوں کے ذریعہ ضرورت کے وقت مسلمان دین میں اضافہ بھی کر سکتے ہیں اور ان کا یہ اضافہ بھی اسی لئے حق ہوگا کہ خدا اور اس کے رسول نے حق کا ایک معیار خود مسلمانوں کے اجماع کو بھی قرار دیا ہے اسی لئے جیسا کہ گذر چکا بعض لوگ قائل بھی ہوں گے کہ اجماع سے دین میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے لیکن میں نے اسی موقعہ پر عرض کیا تھا کہ ختم نبوت کا اتفاقی و اجماعی مسئلہ چونکہ اس سے فنا ہوتا ہے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو تحلیل و تحریم کا اگر اختیار دیا جائیگا تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ دین نہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوا اور نہ آپ کے زمانہ میں کامل ہوا حالانکہ دونوں باتیں قرآن کے نص قطعی کے خلاف ہیں ایک سوال یہ ہے کہ شرعی اقتدار

جو قرآن اور حدیث دونوں کی روشنی میں مسلمانوں کے اجماعی فیصلہ کو حاصل ہو چکا ہے اگر الدین میں اضافہ کا اختیار ان سے نہیں حاصل ہو سکتا تو کیا اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ کسی مظنون مسئلہ کو ان کا اجماع قطعی بنا دے اگر اتنا اثر بھی ان کے اجماع کا نہ مانا جائیگا تو آپ ہی بتایئے کہ مذکورہ بالا قرآنی آیات اور حدیثوں کا اثر کیا باقی رہتا ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ جو شخص ان نصوص سے واقف ہے وہ اجماع کے اس اثر کا جس کے علماء امت قائل ہوئے ہیں کیوں کر انکار کر سکتا ہے۔ باقی مخالفوں کی طرف سے وہ جو عقلی مغالطہ پیش کیا گیا تھا کہ جس جماعت کا ہر فرد کالا ہوگا تو جماعت کیسے گوری ہو جائے گی اسی طرح ہر فرد کے متعلق غلطی کا جب احتمال ہے تو مجموعی طور پر غلطی مٹ کر صحت اور حق سے کیسے متبدل ہو جائے گی تو ظاہر ہے کہ یہ ان کا ایک مثالی استدلال ہے ہم الٹ کر دوسری بیسیوں مثالیں اس کے خلاف پیش کر سکتے ہیں کچھ نہیں تو متواتر اخبار میں یہ لوگ اگر دیکھئے تو کیا ہوتا ہے تو ہرگز ایسا اعتراض نہیں کر سکتے تھے مطلب یہ ہے کہ انفرادی طور پر جن لوگوں کی خبروں میں صدق و کذب کا احتمال رہتا ہے ان ہی کا اجتماع تواتر کی شکل اختیار کرنے کے بعد یقین آفرینی کا کام کرتا ہے پھر کیوں نہ یہی بات اجماع میں سمجھی جائے واقعہ یہ ہے کہ اگر ان لوگوں کے مغالطہ کو مان لیا جائے تو دنیا میں پنچایت۔ جمہوریت وغیرہ کے اصول پر پچھلے زمانوں میں بھی جو اعتماد کیا گیا، اور اس زمانہ میں تو سارا دارومدار تمام مسائل کا کمیٹیوں مجلسوں وغیرہ ہی پر ہے یہ سارا نظام ہی غلط ہو جائے گا کیونکہ ان لوگوں کے بیان کا مطلب تو یہی ہوا کہ فرداً فرداً افراد کا جو حکم ہے وہی حکم ان کے اجتماع کا بھی باقی رہے گا بس کمیٹی کے ہر ہر رکن کے فیصلوں کی جو نوعیت ہو گی جب یہی نوعیت کمیٹی کی بھی باقی رہے گی تو کمیٹی کرنے اسمبلی بنانے پارلیمان قایم کرنے کا سارا کاروبار ہی لغو و مہمل ہو کر رہ جائے گا۔

ابن حزم کا اجماع پر ایک سخت آخری اعتراض اب آخر میں اجماع کے متعلق صرف ایک بحث رہ جاتی

ہے اور یہی بحث غالباً اس باب میں سب سے زیادہ اہم ہے اور وہ یہ کہ اجماع کا قایم ہونا جب اس پر موقوف ہے کہ سارے جہان کے مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہو تو سوال یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے آرار سے واقف ہونا کیا ممکن بھی ہے؟ ابن حزم نے بڑے شد ومد کے ساتھ اس سوال کو اٹھایا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرام دنیا کے مختلف دور دراز علاقوں میں اس طرح پھیل گئے تھے کہ پھر ان کا کسی ایک علاقہ یا ملک میں مجمع ہونا ممکن ہی نہیں ہوا ان کے بعد تابعین کا دور آیا تو اس تفرق اور تشتت کا دائرہ اور وسیع ہو گیا اور وہ مصر۔ ایران۔ افغانستان۔ خراسان۔ اندلس اور افریقہ وغیرہ ممالک میں پھیل گئے اس کے بعد ابن حزم نے اپنی عادت کے مطابق قائلین اجماع کے حق میں نہایت تیز و تند اور ناگوار الفاظ استعمال کر کے پوچھا ہے کہ اب اس صورت میں کوئی بتائے کہ کوئی شخص ان تمام ممالک کے مفتیوں کا کسی ایک مسئلہ پر اتفاق کیوں کر معلوم کر سکتا ہے (احکام الاحکام ج ۴ ص ۱۳)

ابن حزم کے اس اعتراض کا جواب | واقعہ تو یہ ہے کہ حافظ ابن حزم نے اجماع کی جو تصویر اپنے زور قلم سے کھینچی ہے اگر اصطلاحی اجماع بھی یہی ہے یعنی ارکان اجماع کے ہر ہر فرد کے لئے ذاتی طور پر ضروری ہو کہ اپنی زبان یا قلم سے اتفاق کا اظہار کریں تو کوئی شبہ نہیں کہ اس قسم کے اجماع کو جس حد تک ناممکن اور محال قرار دیا جائے قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اجماع سے ائمہ اصول فقہ کی کیا یہی مراد ہوتی ہے یہ مسئلہ ذرا محل تامل ہے اپنی دوسروں کو تو جانے دیجئے میں حافظ ابن حزم ہی سے پوچھتا ہوں کہ بالکلیہ اجماع کے تو آپ بھی منکر نہیں ہیں آپ ہی نے تو لکھا ہے۔

وکذا لک اجماع اھل الاسلام کلھم   اسی طرح تمام اہل اسلام کا اس پر اجماع ہے